تفہیم القرآن

(۴)

البقرہ

(از رکوع ۲۴ تا رکوع ۳۲)

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ انسان کے لیے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں[1]۔ نیز اُن سے کہو، یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو، نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ

---

[1] چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانہ میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام، تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی و بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلہ میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انہی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے آدمیوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے کئی مہینے حج ہی سے وابستہ تھے اور ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[۱]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں[۲]، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[۳]۔ اُن سے لڑو جہاں بھی تمھارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور اُنھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف اُنھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز

---

[۱] منجملہ اُن توہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار کود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے بلکہ تمام اوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنی رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۲] یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمھارا راستہ روکتے ہیں اور اس دین کی اشاعت اور اس کے قیام میں مزاحمت کر رہے ہیں اُن سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے تک مسلمانوں کو صرف دعوت و تبلیغ کرنے کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم و ستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب ان کو پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ تمھارے اس دین کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں اُن کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے بعد ہی جنگِ بدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

[۳] یعنی تمھاری جنگ نہ تو اپنی مادی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھایا جائے جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کیے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں کو قتل کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا، اور دوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال حد سے گذرنے کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی ممانعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اسی حد تک کیا جائے جتنی اس کی ضرورت ہو۔

آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[1]

تم اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے،[2]
پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں[3]۔ ماہِ حرام کا بدلہ

[1] یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گنہگار کو بھی معاف کر دیتا ہے جبکہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آجائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے بس اسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے۔ اور جب وہ اپنا رویہ چھوڑ دے تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اُٹھے۔

[2] فتنہ کے اصل معنی آزمانے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ سنار جب سونے کو کٹھالی میں ڈال کر تپاتا ہے تو اسے فتنہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اُسے آگ کی آزمائش میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ اس میں کھوٹ ہے یا نہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے اُس حالت کو یہاں فتنہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ کفار برسرِ اقتدار ہوں، کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں، اور خدا پر ایمان رکھنے والے اُن کے قہر و غلبہ کی وجہ سے احکامِ الٰہی پر کلاً یا جزءً عمل نہ کر سکتے ہوں، کیونکہ اس حالت میں مومن کا ایمان بھی سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔

دین کے اصل معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد انسان کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ کسی بالاتر اقتدار اور کسی بالاتر قانون کو تسلیم کر کے باضابطگی کے ساتھ اس کی اطاعت میں زندگی بسر کرے۔ ایسے ہر نظامِ اطاعت و بندگی کو دین کہا جائے گا قطع نظر اس سے کہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔

لہٰذا اس آیت کی رُو سے اسلامی جنگ کی غایت یہ قرار پائی کہ فتنہ کی حالت (یعنی غلبۂ کفر و کفار کی حالت) ختم ہو جائے اور اطاعت و بندگی کا پورا نظام اللہ کے لیے خالص ہو کر رہے۔

[3] باز آجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے، اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اُسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا

(باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

ماہِ حرام ہی ہے[1] اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو[2]۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے[3]۔

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عمرے[4] کی نیت کرو تو اُسے پورا کرو۔ اور اگر کہیں گھر جاؤ[5]

(بقیہ صفحہ سابق) کسی کا بندہ بنائے۔ یہ فتنہ بزورِ شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اُس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] عرب میں حضرت ابراہیم کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لیے خاص کیا گیا تھا اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل وغارتگری ممنوع تھی تاکہ زائرینِ کعبہ امن وامان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اس بنا پر ان مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی محرمت کا لحاظ کفار کریں تو مسلمان بھی کریں، اور اگر وہ اس حرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کریں تو مسلمان بھی پھر ماہِ حرام ہی میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

[2] اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی وجہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ اہلِ ایمان اگر اس کام میں اپنا مال صرف کرنے سے جی چرائیں اور اپنے مفاد کو عزیز تر رکھیں تو یہ اُن کے لیے دنیا میں بھی موجبِ ہلاکت ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں وہ کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہیں گے اور آخرت میں اُن سے سخت باز پرس ہوگی۔

[3] احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو اُسے بس کر دے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل وجان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

[4] کعبہ کی زیارتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو ذی الحجہ کے چند مقرر دنوں میں کی جاتی ہے

(باقی صفحہ ۲۲۱ پر)

تو جو قربانی میسر[۱] آئے اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنا سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے[۲]۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اُسے چاہیے کہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے[۳]۔ پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے[۴] (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اُٹھائے وہ حسب مقدور قربانی دے اور جو قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں[۵]۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب

(بقیہ صفحہ ۲۲۰) اس کا نام حج ہے۔ اور دوسری وہ جو ان مقرر ایام کے ماسوا دوسرے دنوں میں کی جاتی ہے۔ یہ عمرہ ہے۔

[۵] یعنی اگر راستہ میں کوئی سبب ایسا پیش آجائے جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر آئے۔

[۲] اس امر میں اختلاف ہے کہ جگہ سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے یعنی اگر آدمی راستہ میں رُک جانے پر مجبور ہو تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھِر گیا ہو وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

[۳] حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

[۴] یعنی وہ سبب دور ہو جائے جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستہ میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانہ میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کا سبب زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں "گھِر جانے" اور اس کے بالمقابل یہاں "امن نصیب ہو جانے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح "گھِر جانے" کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دوسرے تمام موانع شامل ہیں اسی طرح "امن نصیب ہو جانے" کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دور ہو جانے پر حاوی ہے۔ (باقی حواشی صفحہ ۲۲۲ پر)

ع جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کا فیصلہ کرے اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل[لہ]، کوئی بدکاری[عہ]، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات[تہ] سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے[کہ] بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو[عہ]۔ اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں[ہ]۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۱) شہ عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرہ کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کرلیں۔ البتہ جو لوگ مکہ کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں انھیں اس رعایت سے مستثنیٰ کر دیا کیونکہ ان کے لیے عمرہ کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اُٹھانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کرکے احرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں، پھر جب حج کے دن آئیں تو ازسرِ نو احرام باندھ لے۔

(حواشی صفحہ ہذا) لہ احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلقِ زن و شو ممنوع ہے بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

عہ تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

تہ حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

کہ جاہلیت کے زمانہ میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنا اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں (باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اُس نے تمھیں کی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔[لہ] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو،[ٹہ] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور

(بقیہ صفحہ سابق) فقیری کی نمائش کرے تو خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی۔

[ھہ] یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ معاش ایک دنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [لہ] یعنی جاہلیت کے زمانہ میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے اس کے مطابق خالصۃً اللہ کی عبادت کرو۔

[ٹہ] حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا طریقہ یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کے ساتھ عرفات جاتے تھے اور رات کی صبح کو وہاں سے مزدلفہ کی طرف پلٹتے تھے۔ بعد کی صدیوں میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم ہوگئی تو انھوں نے کہا ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبہ سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور اُن دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہوگئی اور انھوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتہ دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطاب عام اُن سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں انہی کے ساتھ جاؤ، (باقی صفحہ آئندہ پر)

رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آبا واجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر[1]۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں، پھر جو کوئی دو دن پہلے واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کسی نے دو دن زیادہ صرف کر لیے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں[2]، بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں ـــ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے[3]، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے[4]۔ جب اُسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) انہی کے ساتھ ٹھہرو، انہی کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بنا پر سنت ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اہل عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے اب اسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔

[2] یعنی ایام تشریق میں منیٰ سے مکہ کی طرف واپسی خواہ دو دن پہلے ہو خواہ دو دن بعد، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ تم ٹھہرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھہرے ان میں خدا کے ساتھ تمہارے تعلق کا کیا حال رہا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

اقتدار حاصل ہو جاتا ہے[۲۵] تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتیوں کو غارت کرے. اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے ـــ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ـــ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اس کو پکڑ کر گناہ پر جما دیتا ہے. ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہو سکتی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے. دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے. اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ[۲۶] اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھُلا دشمن ہے. جو صاف صاف ہدایات تمھارے پاس آچکی ہیں اگر اُن کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور بڑا حکیم و دانا ہے. (اگر اِن ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آموجود ہو

(بقیہ حواشی صفحہ ۲۲۴) [۲۳] یعنی کہتا ہے خدا شاہد ہے کہ میں محض طالبِ خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ صرف حق اور صداقت اور انسانوں کی فلاح کے لیے کام کر رہا ہوں۔

[۲۴] اصل لفظ ”اَلَدُّ الْخِصَامِ“ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ”تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا“. یعنی جو دشمنی میں ایسا اندھا ہو جائے کہ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی، غرض کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال سے بھی کام لینے میں تامل نہ کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۲۵] اِس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے. اور دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ مزے مزے کی دل لبھانے والی باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

[۲۶] یعنی کسی استثناء اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ماتحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریات، تمھارے علوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات، اور تمھارے سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابعِ اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔

اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟[1] — آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور میں ہونے والے ہیں۔ ع ۲۵

بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کُھلی کھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دکھائی ہیں، اور پھر یہ بھی انھی سے پوچھ لو کہ اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔[2]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت

---

[1] یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ اِن سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش ہی اس امر کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا، اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے، اور تم بچشمِ سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکن ہے، اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے۔ اس وقت تو کوئی کٹے سے کٹا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی اور جب

(باقی صفحہ ۲۲۷ پر)

کے روز پرہیزگار مومن ہی اُن کے مقابلہ میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے اُن کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے[1]۔

(بقیہ صفحہ سابق) وہ ساعت آگئی تو پھر نہ مہلت ہے نہ آزمائش، بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔

ملہ اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وجوہ سے کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آثار قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامانِ عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کتاب اور نبوت کی مشعل دیکر دنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا اور پھر اس نے دنیا پرستی، نفاق، اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہوکر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہذا جو گروہ اس قوم کے بعد امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے اُس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے تو وہ یہی قوم ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقار کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان ہی کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اِس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے، نہ اس لیے کہ ان کو حقیقت بتائی نہیں گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انھیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔

پھر کیا[سلہ] تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گذرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گذریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی — اُس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ بھلائی کی راہ سے تم جو کچھ بھی خرچ کرو اپنے والدین، اقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے کرو، اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیدیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے — ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو

(بقیہ صفحہ سابق) ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور ایک نئی امت بنا دے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اُس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انھیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ اوپر کی آیت اور اِس آیت کے درمیان ایک پوری داستان ہے جسے ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ یہ آیت خود اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، اور قرآن کی مکی سورتوں میں (جو سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھیں) یہ داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ انبیاء جب کبھی دنیا میں آئے انھیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلہ میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ آمنّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اِس "آمنّا" کا قدرتی تقاضا ہر زمانہ میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے اُسے قائم کرنے کی کوشش کرے (باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ع۲۶

لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اُس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور خود اس سے باز رہنا، مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور یہ فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔[1] وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر اُن کا بس چلے تو تمھیں اس دین سے پھیر لے جائیں، (اور یہ تمھارے لیے ایسا بڑا خطرہ ہے کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر گیا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔[2] بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے

(بقیہ صفحہ سابق) اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] کفارِ مکہ اور یہودیوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ لوگ دعویٰ تو کرتے ہیں خدا پرستی کا مگر ماہِ حرام میں بھی لڑنے سے نہیں چوکتے۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے۔

[2] مسلمانوں میں سے بعض لوگ جن کے ذہن پر صلح پسندی کا ایک غلط تصور مسلط تھا کفارِ مکہ اور یہودیوں کے اعتراضات سے متاثر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم اپنی ان باتوں سے یہ امید نہ رکھو کہ تمھارے اور اُن کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ اُن کا تم سے کوئی زن، زر، زمین کا جھگڑا تو ہے نہیں کہ کچھ لین دین پر صلح ہو جائے۔ اُن کو تو یہ بات کھلتی ہے کہ تم اس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو تمھارے اور ان کے درمیان صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسے دشمنوں کو تم معمولی دشمن نہ سمجھو۔ جو تم سے مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے وہ کمتر درجہ کا دشمن ہے، مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے وہ تمھارا بدترین دشمن ہے، کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دنیا ہی خراب کرتا ہے لیکن یہ دوسرا تمھیں آخرت کے ابدی عذاب میں دھکیل دینے پر تُلا ہوا ہے۔

ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد[1] کیا ہے وہ رحمتِ الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پوچھتے ہیں شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں انسان کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا نقصان اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے[2]۔

پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو، جو کچھ بچا سکو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے[3]؟ کہو، جس طرزِ عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی

---

[1] جہاد = کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے جنگ کے لیے تو "قتال" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے، اور ہر اُس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے حتیٰ کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے "جہاد"، اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے، اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

[2] یہ شراب اور جوے کے متعلق پہلا حکم ہے جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی پھر شراب اور جوے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔

شراب کے لیے "خمر" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق اگرچہ عرفِ عام میں شراب ہی پر ہوتا ہے، لیکن اس کے حکم میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو انسان کی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ کو معطل کر کے اس کی باقی تمام قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ شترِ بے مہار کی طرح جو چاہے کرے۔ اور "جوے" کا اطلاق ہر اُس معاملہ پر ہوتا ہے جس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملہ میں تم پر سختی کرتا مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، مشرک شریف زادی سے مومن لونڈی بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، مشرک شریف سے مومن غلام بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے[۱]۔ اُس نے اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں، شاید کہ وہ سبق لیں اور

(بقیہ سابق) ایک آدمی کا مال دوسرے آدمی کو محض بربنائے اتفاق ملتا ہے بغیر اس کے کہ لینے والا کسی تمدنی خدمت کی بنا پر اس کا مستحق ہو یا دینے والے کو اس مال کے معاوضہ میں کوئی تمدنی فائدہ حاصل ہو۔

[۲] قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا بار بار سختی کے ساتھ حکم دیا گیا تھا، یہاں تک فرمایا گیا کہ "یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو" اور یہ کہ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں"۔ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملہ کی صحیح صورت کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اوپر جو حکم دیا گیا تھا، اس آیت میں اس کی علت و مصلحت بیان کر دی گئی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ تعلق ہو تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

ع ۲۷ نصیحت قبول کریں۔

پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو، وہ ایک بیماری کی حالت ہے، اُس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں[1]۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے[2]، اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی پسند کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ[3]، مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[4] اور اللہ کی ناراضی سے بچو،

(بقیہ سابق) مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثر ہو جائے گی۔ اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایسی ایک معجونِ مرکب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے تب بھی اُس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] قرآن مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے، اس لیے اس نے الگ رہو اور قریب نہ جاؤ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہنود اور بعض دوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ زن و شو سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

[2] حکم سے مراد حکمِ فطری ہے جو انسان و حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہے۔ (باقی حواشی صفحہ آئندہ پر)

خوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی جو تمھاری ہدایت کو مان لیں انھیں فلاح وسعادت کا مژدہ سنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو[1]۔ اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو[2] ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے،[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۲) [3] یعنی فطرۃ اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیرگاہ نہیں بنایا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

[4] جامع الفاظ ہیں جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمھارے دنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو اس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرہ میں اس بات پر بھی تنبیہ فرمادی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً کوتاہی کی تو اللہ تم سے باز پرس کرے گا۔

(حواشی صفحۂ ہذا) [1] احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفارہ آگے چل کر قرآن میں بیان ہوا ہے۔

[2] یعنی بطور تکیہ کلام کے بلا ارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں۔ ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اگر انھوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے[۵۱]، اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو[۵۲] تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۵۳]۔

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اُن کا مواخذہ ہوگا۔

[۵۰] اصطلاحِ شرع میں اس کو ایلاء کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے، بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ ازدواج میں تو بندھے رہیں مگر عملاً ایک دوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی کہ یا تو اس دوران میں اپنے تعلقات درست کر لو، ورنہ ازدواج کا رشتہ منقطع کر لو تاکہ دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

آیت میں چونکہ "قسم کھا لینے" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لیے فقہائے حنفیہ اور شافعیہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلقِ زن و شو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدت ہے، اور ایک قول امام احمدؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔

حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے جو بگاڑ کی وجہ سے ہو، رہا کسی مصلحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا جبکہ تعلقات خوشگوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہاء کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلاء ہے اور اُسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلقِ زن و شو قائم کر لیں تو ان پر قسم توڑنے کا کفارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اسے قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ غفورٌ رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارہ سے تمھیں معاف کر دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفارے کو قبول کرے گا اور ترکِ تعلق کے دوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دوسرے پر کی ہو اسے معاف کر دیا جائے گا۔

[۵۲] حضرات عثمانؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہم کے نزدیک رجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو اُسے چھپائیں انھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اِس عدت کے دوران میں انھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں سلہ۔

(حواشی صفحہ سابق) اس مدت کا گذر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اس لیے مدت گذرتے ہی طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاق بائن ہوگی، یعنی دورانِ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا البتہ اگر وہ دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمر، علی، ابن عباس اور ابن عمر سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے اور فقہاء حنفیہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔ سعید ابن مسیب، مکحول، زہری وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینہ کی مدت گذرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی، مگر اُن کے نزدیک وہ ایک طلاق رجعی ہوگی، یعنی دورانِ عدت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہوگا اور رجوع نہ کرے تو عدت گذر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں تو نکاح کر سکیں گے۔ بخلاف اس کے حضرت عائشہ، ابو الدرداء اور اکثر فقہاءِ مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت گذرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت سے رجوع کر، یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمر، حضرت علی اور ابن عمر کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالک و شافعی نے اسی کو قبول کیا ہے۔

سٹہ یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمھاری زیادتی سے واقف ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) سلہ اصل میں لفظ "قرء" استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک قرء سے مراد حیض ہے اور اس رائے کے بموجب جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے اس وقت تک طلاق بائن نہ ہوگی اور شوہر کو رجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرت ابوبکر، عمر، علی، ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، ابنِ مسعود اور بڑے بڑے صحابہ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حنفیہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اس کے دوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہ، ابنِ عمر، اور زید ابنِ ثابت کی ہے۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں، البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے، اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔

طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے[1] ___ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، البتہ وہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے[2]۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں ___ پھر اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو رخصت کرنے ہی کا فیصلہ کیا اور تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ

(بقیہ صفحہ سابق) مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اس صورت سے متعلق ہے جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صورت میں شوہر کو حقِ رجوع نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا [1]) طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو طُہر کی حالت میں ایک بار طلاق دی جائے، پھر دوسرے طہر میں اگر چاہے تو ایک اور طلاق دے دے۔ اس صورت میں شوہر کو حق رہتا ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر عدت گزر بھی جائے تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دی جائیں، تو یہ سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳۷ پر)

اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دیدے[سلہ]، تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو یا بھلے طریقہ سے انھیں روک لو یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دو، محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا[سلہ]۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو[سلہ]۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ ع۲۹

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع

(بقیہ صفحہ سابق) [سلہ] اسی چیز کا نام خلع ہے، یعنی اگر عورت طلاق لینے کی خواہشمند ہو تو وہ شوہر کو کچھ دے کر طلاق حاصل کرلے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [سلہ] احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اُس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرلے کہ وہ نکاح کے بعد اُسے طلاق دیدے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی، اور ایسے سازشی نکاح وطلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ لوگ پہلے تو اپنی حماقت سے بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں، پھر اس پر پچھتاتے ہیں اور سازشی طریقہ سے حلالہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دراصل گناہ در گناہ ہے۔

[سلہ] یعنی ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گذرنے سے پہلے محض اس لیے رجوع کرلے کہ اسے پھر ستانے اور دق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رجوع کرتے ہو تو اس نیت سے کرو کہ اب حسن سلوک سے رہنا ہے، ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقہ سے رخصت کر دو۔

[سلہ] یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیکر دنیا کی رہنمائی (باقی صفحہ آئندہ پر)

نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں جب کہ وہ معروف طریقہ سے باہم مناکحت پر راضی ہوں[1]۔ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمھارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں[2]۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقہ سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے ـــــ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچہ کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے[3] ـــــ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقہ پر ادا کردو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم امتِ وسط بنائے گئے ہو تمھیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمھارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے روحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اٹھاؤ، اور دنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہو اور زمانۂ عدت کے اندر اس سے رجوع نہ کیا ہو، پھر وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے کے لیے راضی ہوں تو عورت کے رشتہ داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

[2] یہ اس صورت کا حکم ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہوں (خواہ طلاق کے ذریعہ سے یا خلع یا فسخ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اُن کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینہ دس دن روکے رکھیں[۲۵۸]۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقہ سے جو چاہیں کریں، تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، اللہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارہ کنایہ میں ظاہر کر دو، خواہ دل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی، مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا، اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقہ سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے لہٰذا اس سے ڈرو، اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگذر فرماتا ہے۔ ع ۳۰

تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دیدو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے[۲۵۹]۔ خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا، یہ اور

(بقیہ صفحہ سابق) و تفریق کے ذریعہ سے) اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔

[۲۵۷] یعنی اگر باپ مرجائے تو جو اس کی جگہ بچہ کا ولی ہو اُسے بھی یہ حق اسی طرح ادا کرنا چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۲۵۸] یہ عدتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی عدتِ وفات وضع حمل تک ہے خواہ وضع حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہو جائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں۔

[۲۵۹] اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہر حال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مقدرت اس کی تلافی کرو۔

بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دیدے)، اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو[1]، تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو[2]، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو[3]۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار،

---

[1] یعنی انسانی تعلقات کی بہتری و خوشگواری کے لیے لوگوں کا باہم فیاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اڑا رہے تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔

[2] قوانینِ تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہہ نکلتا ہے جس میں یہودی بہہ نکلے۔

[3] اصل میں لفظ "صلوٰۃ وسطیٰ" استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد بعض مفسرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشاء، لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا استنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملہ نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ خدا ان لوگوں کی قبریں اور اِن کے گھر آگ سے بھر دے، اِنھوں نے ہماری صلوٰۃ وسطیٰ فوت کرادی۔ اس سے یہ سمجھا گیا کہ آپ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ مطلب زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجہ کی نماز ہم سے فوت کرادی، نماز وقت پر پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے، اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کی ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ اللہ کے آگے فرمانبردار بندوں کی طرح کھڑے ہو، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آ جائے تو اللہ کو اُس طریقہ سے یاد کرو جو اُس نے تمہیں سکھا دیا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم[1] میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں ان کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقہ سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو اُنھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ اُمید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔ ۳۱ع

تم[2] نے ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی[3]

---

[1] سلسلۂ تقریر اوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمہ اور ضمیمہ کے طور پر ہے۔

[2] یہاں سے ایک دوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو راہِ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انھیں ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اُس وقت مکہ سے نکالے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینہ میں پناہ گزیں تھے، اور کفار کے مظالم سے تنگ آ کر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انھیں لڑائی کا حکم دیدیا گیا تو اب ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے جیسا کہ چھبیسویں رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے انھیں عبرت دلائی گئی ہے۔

[3] یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا کہ کنعانی ظالموں کو ارض

(باقی اگلے صفحہ پر)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے[1] تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملہ پر بھی غور کیا جو موسیٰ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں[2]۔ نبی نے پوچھا

(بقیہ صفحہ سابق) فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو تو انھوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی تب اللہ تعالیٰ نے انھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملہ کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] قرضِ حسن، لفظی ترجمہ "اچھا قرض" یعنی ایسا قرض جو خالص نیکی کے جذبہ سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جائے، اللہ اس کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے اور یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کر دوں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

[2] یہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اُس زمانہ میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سردار ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آ چکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق اُن کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلہ میں بائیبل کی کتاب سموئیل اول میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) "سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا ..... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے ..... یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں تو اس کو مان کیونکہ انھوں نے تیری نہیں بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں ..... اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کریگا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالہ میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمتگاروں کو عطا کرے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا اور تمہارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمہارے شکیل جوانوں اور تمہارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور وہ تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا فریاد کرو گے پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے ..... خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو اُن کی بات مان لے اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔"

(باب ۷ آیت ۱۵ تا باب ۸ آیت ۲۲)

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا ..... جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمہارا خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت[له] کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہوگیا؟ اس کے مقابلہ میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے"۔ نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اسی کو منتخب کیا ہے" اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں، اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے"۔ اس کے ساتھ اُن کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ "خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اور

(بقیہ صفحہ سابق) اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمہارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمہارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا ..... اور تم جان لوگے اور دیکھ بھی لوگے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے سے کتنی بڑی شرارت کی .... اب رہا میں سو خدا نہ کرے کہ تمہارے لیے دعا کرنے سے باز آ کر خداوند کا گنہگار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تم کو بتاؤں گا" (باب ۱۲۔ آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتاب سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں اِس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی مذمت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصہ کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بزدل ہو گئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیت آ گئی تھی اور ان کے اندر اخلاقی انضباط کی کتنی کمی تھی جس کے سبب سے آخر کار وہ گر گئے، اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں (باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں؎۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے"۔ ۳۲ع

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں، میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے، ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے؎۔

(بقیہ صفحہ سابق) ؎ بائیبل میں اس کا نام "ساؤل" لکھا ہے اور اس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ "بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور وہ ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے"۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ؎ بائیبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق جس میں تبرکات محفوظ تھے فلسطینی مشرکین نے ایک لڑائی کے موقع پر بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا، لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں، آخر کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملہ کی طرف قرآن اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ "اس صندوق میں تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے" تو بائیبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آگئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اِس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

؎ غالباً دریائے اردن مراد ہے جس کے مغرب میں فلسطین اور مشرق میں شرق اردن واقع ہے۔ بنی اسرائیل اس وقت شکست کھا کر شرق اردن کی طرف ہٹ گئے تھے۔ اب طالوت انھیں لے کر دریا کے مغربی کنارے کی طرف اترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے اس لیے اس نے کارآمد اور ناکارہ لوگوں کو تمیز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہدیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[1] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انھوں نے کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے"۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے تو انھوں نے دعا کی "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر"۔ آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا، اور داؤد[2] نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا ــــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا،[3] لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) ان پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دشمن کے مقابلہ میں پامردی دکھائیں گے جس سے پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ کہنے والے وہی تھے جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

[2] داؤد علیہ السلام اُس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے جبکہ فلسطیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان "جالوت" (جولیَت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلہ کو نکلے۔ حضرت داؤد یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلہ پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے انھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔

[3] یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حد خاص تک زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے اور جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو کسی دوسرے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد، جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے، مگر (اللہ کی مشیت یہ نہ تھی، اسی لیے) لوگوں میں اختلاف ہوا کہ کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر اختیار کیا۔ ہاں، اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۵] ع

(بقیہ صفحۂ سابق) گروہ کے ذریعے سے اللہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی تو یقیناً ملکِ خدا میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا [۵]) مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے آنے کے بعد جو لوگوں میں اختلافات ہوئے، کوئی ایمان لایا کوئی نہ لایا، اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک نوبتیں پہنچیں، تو یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اللہ بے بس تھا، اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر اللہ چاہتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاء کی دعوت سے سرتابی کر سکتا اور کفر و بغاوت کی راہ پر چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا۔ مگر اللہ کی مشیت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لی جائے، اور انھیں ایک خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انھیں اعتقاد و عمل کی راہوں میں انتخاب کی آزادی عطا کی ہے، اور انبیاء کو لوگوں کو کوتوال بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ زبردستی انھیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں، بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ دلائل اور بینات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوئے وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کر لیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا مگر معاذ اللہ اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

اے ایمان لانے والو جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو[1] قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں خرید و فروخت ہو گی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی، ظالم اصل میں وہ جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں[2]۔

---

[1] مراد راہ خدا میں صرف کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

[2] کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو اس حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو خدا کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں، یا وہ لوگ ہیں جو اس دن پر اعتقاد نہ رکھیں یا یہ سمجھیں کہ وہاں نجات خریدنے کا یا دوستی و سفارش سے کام نکال لینے کا کوئی موقع ہو گا۔

ہمارا کتب خانہ

الجہاد فی الاسلام۔ غیر مجلد (للعہ) مجلد (صہ)
رسالہ دینیات (اردو) بے جلد (۱۲ر) مجلد (عہر)
سیاسی کشمکش حصہ اول۔ زیر طبع (۸ر)
" " حصہ دوم (۱۲ر)
" " حصہ سوم (عہر)
مسئلہ قومیت۔ غیر مجلد (عہ)
تنقیحات۔ غیر مجلد۔ عہر) مجلد (عہ)
پردہ۔ غیر مجلد (عہر) مجلد (عہ)
خطبات۔ غیر مجلد (عہر) مجلد (عہ)
تفہیمات۔ بے جلد (عہر) مجلد (عہر)
سلامتی کا راستہ۔ (۳ر)
اسلام کا نظریہ سیاسی (۳ر)
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (۳ر)

اسلام اور جاہلیت (۳ر)
نیا نظام تعلیم (۳ر)
ایک اہم استفتا (۱ر)
ٹوورڈز انڈرسٹینڈنگ اسلام۔ یہ کتاب رسالہ دینیات کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ہندوستان بھر کے انگریزی جرائد اور مجلات نے اس کی تعریف میں شاندار ریویو لکھے ہیں (عہر)
تجدید و احیائے دین:۔ مجددین کے کارنامے اور اُن پر تبصرہ۔ (۸ر)
سیرت سید احمد شہید:۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے والے ایک مبارک گروہ اور اُس کے قابل تقلید بانی کے حالات۔ قیمت دو روپے (عہ)
حقوق الزوجین:۔ ترجمان القرآن کی ایک مقبول عام اشاعت خاص (۸ر)
ہمارے نبی کے صحابہ:۔ صحابہ کرام کے مختصر مگر مفید حالات کا مجموعہ قیمت (۸ر)

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ دار الاسلام پٹھانکوٹ